ڈاکٹر روِش ندیم

استاد شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو ادب کی تاریخ نگاری میں ادوار بندی کا مسئلہ

Dr. Ravish Nadeem

Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad

The Issue of Periodization in Urdu Literary History writing

Periodization is always considered as a complexed but important part of literary history or historiography. It is an out come of an ideology or concept with witch the history is being written or analysed. Urdu literary history writing has not a long and strong tradition. But it has a general trend of periodization which is yet to be revisit.

یہ انسان کا مزاج ہے کہ وہ کسی بھی تفہیم کے لیے عمومیت (generlization) کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے لیے وہ ہمہ گیریت اور لامحدودیت کو چھوٹے چھوٹے اجزا میں بانٹ لیتا ہے۔ وقت کو قرنوں، صدیوں، سالوں، مہینوں، ہفتوں، دنوں، گھنٹوں اور منٹوں سیکنڈوں میں بانٹنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی مختلف حصوں میں تقسیم کرنا اس کے اسی مزاج کا حصہ ہے۔ ورنہ تاریخ تو اسباب اور نتائج کی زنجیروں میں بندھے ایک ایسے تسلسل کا نام ہے جس میں نہ تو کوئی وقفہ آتا ہے اور نہ ہی کوئی بے سبب تبدیلی۔ ایسے میں تاریخ نویسی کے عمل میں تاریخ کے تسلسل کو مختلف ادوار اور ابواب میں تقسیم کرنا ایک پیچیدہ اور مشکل عمل ہے کیونکہ اس سے تاریخ کی درست تفہیم اور مجموعی تصور کے حوالے سے شدید مشکلات پیش آتی ہیں۔ مختلف ٹکڑوں میں تسلسل کے اس کٹاؤ کو عام قاری یا طالب علم کسی فلم کے مختلف سین کی بجائے ٹی وی کے مسلسل لیکن یکسر بدلتے مختلف پروگراموں کی طرح لیتا ہے۔ گو تاریخ کو مختلف ادوار میں بانٹنے سے وقت کا عظیم دھارا خاص انداز سے قابل تفہیم ہو جاسکتا ہے لیکن یہ اپنے ساتھ تاریخی شعور و آگہی کے حوالے سے کئی طرح کے مسائل بھی پیدا کرتا ہے۔ ادوار کی حد بندیاں تاریخ کے تصور اور متخیلہ کو محدود کرتی ہیں اور قاری کے ذہن میں ایک مجموعی تصویر بننے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ کیونکہ ادوار بندی ایک مخصوص تصور اور نظریے کے تحت ہی تشکیل پاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ ادوار بندی کے تحت مخصوص ٹائم پیریڈ کا چناؤ اور اس کی ترتیب ایک خاص ذہنی رویے یا سانچے کی تشکیل پر منتج ہوتی ہے لیکن اس سب کے باوجود تاریخ کی تدریس، تفہیم اور اظہار میں ادوار بندی

ایک عمومی رجحان ہے۔ بقول ڈاکٹر تنویر انجم:

> The study of continuity and change in specific spatio-temporal contexts is what constitutes history. The phenomenon of change serves as a basis for periodization of history, whereby past is periodized, or divided into various eras/epochs/periods, or units of time. The purpose of periodization of past is to render history and time intelligible.(۱)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ میں ادوار بندی سے پیدا ہونے والے تفہیمی مسائل اور ذہنی رویوں کے پیش نظر بہت سے دانشور اس عمل کو قابل تحسین نہیں گردانتے کیونکہ ان کے نزدیک ''ادب کو دور اور عہد میں تقسیم کرنا نہ صرف فنی گناہ ہے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح بھی نہیں ہے۔۔۔عہد اور زمانے کی تقسیم ہر حیثیت سے گمراہ کن ہے اور ادب کی نسبت غلط تاثرات پیدا کرتی ہے۔''(۲)

ایک معاشرے کی تاریخ کے ادوار کی تشکیل اور ان کے مابین فرق یا ان کی انفرادیت کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ حقیقتاً انسانی شعور کے تاریخ کے ایک مرحلے سے اگلے مرحلے کی طرف بڑھنے کے نتیجے میں کئی بنیادی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں جن کی ظاہری صورتوں میں مادی سطح پر کلچر میں تبدیلی ہوتی ہے جبکہ غیر مادی سطح پر فکری تغیر ہوتا ہے جو انسان، کائنات اور معاشرے کے مابین رشتوں کو ایک نئی اساس فراہم کرتا ہے۔ تاریخی شعور کا حامل ایک تاریخ نویس حقیقی ادوار کا تعین ایسے ہی کسی بڑے سماجی تغیر سے کرتا ہے۔ لیکن وہ تدریس، مطالعہ اور تفہیم میں آسانی کے لیے تبدیلی کے مختصر ادوار بھی قائم کر سکتا ہے۔

> جب تاریخی شعور میں اضافہ ہوا تو مؤرخ نے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کون سے حوادث تھے جنہوں نے تاریخی عمل میں تبدیلی کی تو انہیں جنگیں، سیاسی انقلابات، بغاوتیں اور ارضی وسماوی حادثات نظر آئے جنہوں نے معاشرے میں زبردست تبدیلیاں کیں۔ لہٰذا انہوں نے تاریخ کو اس طرح سے تقسیم کیا کہ ان واقعات وحوادث کو مرکز بنا کر ان تبدیلیوں کی نشاندہی کی جو تاریخ میں واقع ہوئیں۔(۳)

گویا ادوار بندی تاریخ کے اٹوٹ سلسلۂ عمل کے غیر یکساں بہاؤ میں کسی خاص مرحلے پر بدلتے ہوئے حالات یا تاریخ کی تفہیم و تجزیہ کے لیے کی جاتی ہے۔ تاریخ کے عمل میں تغیرات، حوادث اور تبدیلیوں کا تعین اور ان کی تعریف ان معیارات، نظریات اور تصورات کی پابند ہوتی ہے جس کے تحت تاریخ کو دیکھا اور پرکھا جا رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے تاریخ کے مطالعے، تفہیم اور تدریس کے لیے ادوار بندی اضافی (relative) حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ ایسے میں تاریخ کے مطالعے کی فکری و نظریاتی جہت بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

تاریخ کے جدید شعور نے فکری سطح پر یہ دریافت کر لیا ہے کہ کسی بھی معاشرے کے تاریخی عہد کی شروعات یا اختتام

کسی بادشاہ یا سپہ سالار کے عروج وزوال سے وابستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دور کو دوسرے دور سے صرف فکری تغیرات، سیاسی نظاموں اور پیداواری وسائل وذرائع کی بنیاد پر ہی الگ کیا جاسکتا ہے۔عمومی تاریخ میں تو مادی ظواہر سے ان کی نشاندہی ممکن ہےلیکن جب معاملہ ادب کی تاریخ کا ہوتو یہ معاملہ ذرامختلف ہوجاتا ہے۔ادبی سطح پر یہ تغیرات فوری طور پر عمومی تاریخی تبدیلیوں کے ساتھ ہی ظہور پذیر ہونے کی بجائے آگے پیچھے اور تادیر تشکیلی عمل سے گزرتے ہیں۔

> ادب میں تبدیلیوں کا اپنا ایک خودکار نظام بھی ہے۔پہلے یہ تبدیلیاں فکری سطح پر ظاہر ہوتی ہیں پھر فکری تبدیلیوں کا اظہار ادب کی خارجی ہیئت کو بھی متاثر کرنے لگتا ہے اور جب یہ خارجی تبدیلی فکری تبدیلی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوجاتی ہے تو نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔(۴)

عہد جدید سے پہلے تک تاریخ نگاری دیومالا، مابعدطبیعیاتی عناصر اور بادشاہوں کے بیان کا گورکھ دھندہ رہی ہے لیکن بعدازاں سائنسی تعقل پسندی اور جدید فلسفے کے باعث اس کے اپنے اصول اور ضابطے وضع ہوئے۔اب تاریخ انسان کے ماضی کی اجتماعی صورت حال کی گہری سطح پر دریافتوں کی بنیاد پر حقائق سے آگاہی کا نام ہے۔تاریخ اور فلسفہ کا ادبی تاریخ نویسی سے گہرا تعلق ہے۔تاریخ اپنا بہت سا خام مواد ادب سے حاصل کرتی ہے کیونکہ انسانی تہذیب کے ہزاروں سال جب تاریخ داستان نگاری اور شاہی بیانات کا ہی ایک حصہ تھی تو ادب نچلی سطح پر فرد کی داخلی و خارجی بپتا کا ریکارڈ محفوظ کرتا رہا تھا۔لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوا کہ تاریخ کے دباؤ نے خود ادب کو متاثر کر کے اس کے مواد اور ہیئت کو متاثر کیا۔جیسے کلاسیکی ادب میں جاگیرداری اقدار و ماحول اور اس کے مابعدطبیعیاتی تصور کے زیر اثر مبالغہ آرائی اور تزئین وآرائش ناگزیر اجزا تھے۔ لیکن جدید دور کے آغاز سے سائنسی وصنعتی شعور کے زیر اثر معاشرتی تصادم وتضاد کی نوعیت تبدیل ہوگئی۔سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا جانے والا ادب اس کی واضح مثال ہے۔

> ادب میں شکوہ اور مبالغہ آرائی باطل قرار پائی اور سادگی، حقیقت پسندی اور نفسیاتی ژرف بینی کے ساتھ فکری پہلوؤں کو نمایاں کیا جانے لگا۔امیجری اور پیکر تراشی میں مادی اور خارجی عناصر کی کارفرمائی بڑھنے لگی۔ادب میں ان واضح تبدیلیوں کے معنی یہ ہونگے کہ ادب کے لیے فکر انسانی کا ارتقاء ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ان ہی تبدیلیوں کے ادراک اور شعور نے ادب اور تاریخ میں عہد اور ادوار کا تصور پیدا کیا ہے۔(۵)

اردو ادب کی تاریخ نویسی کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ہندستان میں انگریزوں اور پریس کی آمد تک شعراء کے حالات وفن کے انفرادی بیان پر مشتمل تذکروں کا رواج تھا۔اردو کی ادبی تاریخ لکھنے کی اولین کاوش محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' ہے جس پر تذکرہ نگاری اور قدیم تاریخ نویسی کے شدید اثرات موجود ہیں۔لیکن زبان و بیان کے حوالے سے قصہ گوئی اور داستان کے شدید اثرات کے باوجود تذکرہ نگاری سے گریز اور حظ کے ہمراہ افادی عناصر کا اظہار ''آب حیات'' میں فکری تبدیلی کا اشارہ ہے۔اسی کشمکش نے اس میں زبان و بیان کی لطافت اور شگفتگی کے باوجود ادبی صداقتوں کو مجروح کیا۔لیکن بعدازاں تقسیم ہند تک دو چار تاریخیں لکھی تو گئیں مگر وہ بھی تاریخ نویسی کے جدید رجحانات کی مکمل نمائندہ نہیں تھیں۔یہ ادب

کے حوالے سے صدیوں پر مشتمل تسلسل، اس کے اتار چڑھاؤ کو تعقل پسند سماجی سیاسی پس منظر کے ساتھ ساتھ تاریخی شعور کو پیش کرنے میں ناکام رہیں۔ تقسیم ہند کے بعد تاریخ نویسی میں تبدیلی کا عمل آگے بڑھنے لگا لیکن مجموعی طور پر ادوار بندی کا مسئلہ اردو کی ادبی تاریخ نگاری کے آغاز سے ہی مصنفین کے لیے ایک چیلنج بنا رہا ہے۔ اولین طور پر یہ کام یا تو لسانی ارتقا میں تبدیلیوں کے تحت کیا گیا یا ادبی اصناف کی بنا پر۔ لہٰذا بقول ظفر الاحسن لاری:

> ہمارے ادبی مورخین نے نہ صرف نظم اور نثر کو الگ کر کے ایک دوسرے سے بے تعلق کر دیا ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ نثر میں ناول اور ڈراما وغیرہ بھی الگ الگ شاخیں کھڑی کر دی ہیں۔ اسی طرح نظم میں غزل، قصیدے، مثنوی اور مرثیے وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ تقسیم قائم کر دی ہیں۔ طلبہ اور عوام کی نگاہ میں شاید یہ تقسیمیں کسی حد تک آسانی کا موجب ہوتی ہیں مگر فنی نقطۂ نظر سے اس تقسیم در تقسیم کا مفہوم یہ ہے کہ حسن کے بھی اتنے ہی ٹکڑے کر دیے گیے۔ جب تک ہم حسن کے اتحاد و وحدت پر ایمان نہ لائیں گے اس وقت تک ہمیں ان تنگ قیود سے نجات نہیں مل سکتی۔ (۶)

دیگر کئی زبانوں کی طرح اردو ادب میں تاریخ کی ادوار بندی کے کئی رجحانات ہیں۔ ہمارے ادبی و سماجی دانشور اور تاریخ نگار ادوار بندی کے حوالے سے جن اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

شاہی و حکومتی حوالے سے جیسے مغلیہ عہد، دورِ اکبری، انگریزی دور، وکٹوریہ عہد، اموی عہد یا ساسانی دور وغیرہ،

ذہنی و فکری حوالے سے جیسے کلاسیکی دور، جدید دور، نشاۃ الثانیہ کا عہد، عہد وسطیٰ، دورِ مظلمہ وغیرہ

شخصی دور حوالے سے جیسے غالب و مومن کا دور، میر و سودا کا عہد، ملٹن کا عہد یا سپنسر کا دور وغیرہ

موضوعاتی حوالے سے جیسے بھگتی کال، ریتی کال وغیرہ

علاقائی حوالے سے جیسے دکن میں اردو، پنجاب میں اردو، لکھنوی عہد، دہلوی عہد وغیرہ

زمانی حوالے سے جیسے متقدمین، متوسطین اور متاخرین وغیرہ

اصناف کے حوالے سے جیسے کلاسیکی غزل کا دور، داستان کا دور وغیرہ

دبستانوں کے حوالے سے جیسے دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ وغیرہ

تحریکوں کے حوالے سے سرسید تحریک، رومانوی تحریک یا ترقی پسند تحریک وغیرہ

سیاسی حوالے سے جیسے انگریز عہد، غلامی کا دور، آزادی کے بعد، مارشل لاء کا دور وغیرہ

نوآبادیاتی حوالے سے جیسے نوآبادیاتی دور، قبل از نوآبادیاتی عہد، بعد از نوآبادیاتی دور وغیرہ

معاشی حوالے سے جیسے جاگیرداری دور، سرمایہ داری دور، اشتراکیت کا عہد، صنعتی دور وغیرہ

طبقاتی حوالے سے جیسے شاہی دور، عوامی دور، نوابی دور، جدید طبقہ وغیرہ

معدنی حوالے سے جیسے کانسی کا دور، لوہے کا دور، تانبے کا دور وغیرہ

ایجادات کے حوالے سے کمپیوٹر کا دور، مشین کا دور، پہیے کا دور وغیرہ

مذہبی حوالے سے جیسے ہندو دور، اسلامی دور، عیسائی دور، مشرکین کا دور، عہد کفار وغیرہ
ارتقائی حوالے سے جیسے، پنجابی زبان میں صوفیانہ شاعری، اردو میں طنز ومزاح وغیرہ
سنین کے حوالے سے جیسے پہلا دور ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک۔ دوسرا دور ۱۷۰۰ء سے ۱۸۰۰ تک، تیسرا دور ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۷ء تک وغیرہ

ادوار بندی کے اتنے رجحانات ادب کے قاری کو پریشان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ایسے میں یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر تاریخ میں کسی بھی دور کا تعین کیسے کیا جائے؟ لیکن اس سے بھی پہلے ایک اہم معاملہ یہ ہے کہ ادوار بندی کا مسئلہ اس بات سے گہرے طور پر جڑا ہوا ہے کہ کس کی تاریخ لکھی جارہی ہے اور کس نقطۂ نظر یا مکتبہ فکر کے تحت لکھی جارہی ہے؟ ہمارے ہاں ادبی تاریخ تو ایک طرف، عمومی تاریخ نگاری ابھی تک قدیم تصورات ورجحانات سے جان نہیں چھڑا سکی ہے۔ اس پر ابھی تک قدیم شاہی وقائع نویسوں کے ساتھ ساتھ شبلی نعمانی اور نسیم حجازی کے اثرات بہت واضح ہیں۔ جبکہ عالمی سطح پر تاریخ لکھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے بیسیوں رجحانات سامنے آچکے ہیں۔ ہمارے ہاں مقبول ترین انداز صرف رومانی، تاثراتی اور عمرانی ہیں۔نفسیاتی، سائنسی، مارکسی، نومارکسی، اشتراکی، تانیثی، عوامی، مذہبی، ساختیاتی، نوتاریخی، افادی، نوآبادیاتی، بعداز نوآبادیاتی، جدیدیت پسند، مابعد جدیدیت پسند، ساختیاتی، ردتشکیلیت پسند، اساطیری، تہذیبی، نسلی وغیرہ جیسے بے شمار مکتبۂ ہائے فکر کی طرف ابھی دیکھا بھی نہیں گیا کہ جن کے اجتماعی شعور سے ہمارے ہاں ماضی کی حقیقت کا اعلیٰ تر فہم حاصل ہو سکے۔ ادوار بندی بھی انہی زاویوں یا جہتوں کے تحت تشکیل پاتی ہے۔اسی لیے بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

> ادوار کوئی مستقل چیز نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ آپ کن رجحانات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں اور انہیں کس طرح دوسرے رجحانات سے الگ کرتے ہیں۔۔۔ یہ تو جن خصائص کو بیان کرنا ہے ان کی ضرورت کے مطابق طے کرنا ہوتا ہے۔۔۔۔ دنیا میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک رجحان ابھرا وہ ختم ہو گیا تو دوسرا آیا، یہ رجحانات ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اور متوازی چلتے ہیں، اس لیے یہ سمجھنا کہ واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹ میں چیزیں بٹی ہوئی ہیں، صحیح نہیں ہے۔(۷)

لیکن ادوار بندی کی تشکیل میں اصولاً بنیادی بات یہ ہے کہ تاریخی ارتقا میں تبدیلی کے واضح ترین آثار ہی ادوار بندی کی بنیاد ہیں۔ادب میں اجتماعی سطح پر ایک عہد کے تخلیق کاروں کا فکر وفن جوان سے قبل اور بعد کے ادوار کے تخلیق کاروں سے مختلف ہو بشمول بقول ہڈسن (۸) "....treatment, manner, spirit,tone" اور موضوعات، زبان، اصناف سمیت سب نئے عہد کے تعین میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ادبی تاریخ نویس ان سب کے مطالعے اور دریافت کے ساتھ ساتھ اس انفرادیت کی سماجی سیاسی، معاشی، فکری اور ثقافتی وجوہات کو بھی تلاش کرتا ہے۔

ادبی تاریخ نگاری چونکہ تاریخ نویسی کی ہی ایک شاخ ہے اس لیے اس کے اصول، ضوابط، بنیادی لوازمات وغیرہ وہی ہیں جو کہ عام تاریخ نویسی کی بھی بنیاد ہیں۔البتہ اس کا دائرہ کار ادب اور اس کے متعلقات تک محدود ہوتا ہے۔ بقول

ڈاکٹر ناصر عباس نیئر ''ادبی تاریخ میں بنیادی اہمیت ادبی متون کو حاصل ہے۔ تاریخیت کے سرگانہ اصولوں کو ادبی مضمون پر ہی لاگو کیا جانا چاہیے اور تسلسل وارتقا کی کڑیاں انہی متون کے اندر تلاش کی جانی چاہئیں۔''(۹) لہٰذا ادبی تاریخ نویس ایک عہد کے ادبی متون یا تخلیقات کا تقابلی مطالعہ دوسرے دور کے ادبی فن پاروں سے کرتے ہوئے ہر دور کے متون کی انفرادی خصوصیات سمیت ادوار کے لحاظ سے ان کے اجتماعی امتیازات کا فی سمیت سماجی سیاسی معاشی، ثقافتی، طبقاتی، نسلی، دیومالائی، فکری کھوج لگاتا ہوا تاریخ ادب کو ادوار میں تقسیم کر دیتا ہے۔

عمومی تاریخ جو سماجی سیاسی (socio-political) بنیادوں پر اپنی ادوار بندی کرتی ہے ادب کو بھی براہ راست متاثر کرتی ہے۔ دوسرے دور سے ممتاز کرنے والے ایک دور کے اپنے امتیازات کی نشاندہی تاریخی عمل کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب کا بھی تقاضا ہوتی ہے تاکہ تاریخ محض منتخب تخلیق کاروں کی کھتونیاں بن کر نہ رہ جائے بلکہ ارتقائی حوالے سے اسے دیگر ادوار سے ممتاز کرنے والے امتیازات اور ان کی ہمہ گیر وجوہات کا بیان بن جائے۔ مگر ان امتیازات کی طرح ہر دور کی کچھ مماثلتیں بھی ہوتی ہیں جو دو مختلف ادوار کے مابین موجود اس شکست وریخت اور کشمکش کے عبوری زمان میں قائم ہوتی ہیں جب تک کہ ایک عہد فکری، قدری اور مادی سطح پر اپنی انفرادیت کی تشکیل مکمل نہیں کر لیتا۔ مثلاً ہمارے ہاں چونکہ جاگیرداری وقبائلی نظام ابھی تک مکمل طور پر نہیں ٹوٹا جبکہ سرمایہ داری جدیدیت بھی ہمارے معاشرے میں در آئی ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کلاسیکی مثنوی، غزل اور داستان کے اثرات ابھی تک بہت شدید ہیں۔ دو مختلف ادوار کے اثرات کا آمیخت ہو کر کوئی واضح شکل اختیار نہ کرنے کا عمل اس عبوری دور میں بہت نمایاں ہوتا ہے جو ایک تاریخ نویس کو مغالطے کا بھی شکار کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہاں اس کا تاریخی شعور بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادب میں ایک دور کا دوسرے دور سے ارتقائی تعلق جانچنے کا یہ لمحہ بہت اہم ہوتا ہے۔

ادبی سطح پر ہر عہد اپنا اظہار صنف کے تبدیلی کے ساتھ بھی کرتا ہے۔ عہد ساز سماجی سیاسی تغیرات پرانی ادبی اصناف کو مٹا کر نئی اصناف کی تشکیل کرتی ہیں یا پرانی اصناف نیا فکری نظام اور نیا قالب اختیار کر لیتی ہیں۔ ہندستان میں فارسی حکمرانوں کی آمد سے فارسی ادب کی اصناف اور انگریزوں کی آمد سے انگریزی ادب کی اصناف اردو میں در آئیں۔ لیکن یہ محض نقالی نہ تھی بلکہ وہ تمام ادبی ہیئتیں اپنے اپنے عہد کی نمائندہ تھیں جنہیں سماجی سیاسی اقتصادیات (socio-political-economics) کے ڈھانچے نے جنم دیا تھا۔ جدید دور کی آمد کے ساتھ ہی قصیدہ، مثنوی، رزمیہ، ہجو، شہر آشوب، ریختی اور داستان وغیرہ کی جگہ افسانہ، ناول، نثری وآزاد نظم وغیرہ کا ظہور اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ شاید اسی لیے ٹی ایس ایلیٹ کی طرح جے اے سمنڈس بھی ادبی اصناف پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ادبی اصناف کا ارتقا ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزو ہے کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے ہیں اور بلآخر ختم ہو جاتے ہیں۔''(۱۰)

ادب کا مورخ ادبی اصناف کے عروج وزوال کے ساتھ مختلف ادوار کی ادبی تحریکات کا بھی پتا لگاتا ہے کیونکہ تحریکات درحقیقت کسی بھی عہد کے مطالبات، امنگوں اور ردعمل کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ تاریخ انسانی کی ساخت میں کارفرما شخصی و غیر شخصی افکار اور رجحانات کے باہمی تاثرات کی توضیح اور نشان دہی کے ساتھ ساتھ اہل زبان وادب کے ماحول، حالات، ان

کے تمدن وثقافت اور ان کے مختلف ادوار کی قوتوں کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ادیبوں کے ذاتی وغیر ذاتی رجحانات وتاثرات کے بیان سے ادب، زندگی اور اجتماعی ماحول کے ان باہمی تعلقات اور آویزشوں کو واضح کیا جاتا ہے جن کے باعث ادب کے ادوار میں امتیاز اور انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی وثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں کرنے پر زور دیتے ہیں:

> ادبی مورخ کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ جب تاریخ کا جلوس اپنی ایک منزل پوری کر لے تو وہ اس بات کا جائزہ لے کہ اس طویل یا مختصر سفر کے ثمرات اور حاصلات کیا ہیں؟ روایت کس حد تک آگے بڑھتی ہے؟ فکر وخیال کی سطح پر کیا تجربات کیے گیے ہیں؟ اس سفر میں کون کون سی تبدیلیاں ممکن ہو سکی ہیں اور کیا ان تبدیلیوں کی بنا پر ہم اس سفر کو کسی خاص نام سے منسوب کر سکتے ہیں جیسے ایہام گوئی یا تازہ گوئی کا دور وغیرہ۔ اگر ادبی تاریخ کو ایک متحرک جلوس سمجھ لیا جائے تو ادبی مورخ اس جلوس میں ہم سفر ہوتا ہے۔ وہ اس جلوس کے مختلف حصوں میں گھومتا پھرتا ہے اور ہر حصے کا بغور مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ ایام کی گردش کے ساتھ ساتھ وہ جلوس کے ہم راہ مستقبل میں آنے والے ادوار میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ (۱۱)

اردو میں تذکرہ نگاری دراصل کسی فرد کی انتہائی ذاتی آراء پر مشتمل تحریر ہوتی تھی۔ اس پر تاریخ نگاری کے حوالے سے نہ تو کوئی شعور کی لہر دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی کوئی اثرات۔ اسی لیے ان کے ہاں ادوار بندی کا تعلق زبان وشعر یا ان سے متعلقہ شخصیات سے ہوتا تھا۔ کسی بھی تذکرے میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی زمانی تقسیم اولین طور پر قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے ''مخزن نکات'' میں کی تھی۔ اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی اولین کاوش ''آب حیات'' میں '' تذکروں کی فہرست ساز تنقیدی روایات سے انحراف'' (۱۲) کے ساتھ ساتھ قدرے تاریخی شعور کے ساتھ ادوار سازی تو کی گئی لیکن وہ بھی تذکروں کی طرح زمانی نہیں تھی۔ بقول محمد حسین آزاد انہوں نے زبان اردو کو عہد بہ عہد تبدیلی کے لحاظ سے پانچ ادوار میں تقسیم کیا کیونکہ ''ہر ایک دور اپنے عہد کی زبان بلکہ اس زمانے کی شان دکھاتا ہے۔'' (۱۳) یوں یہ ادوار بندی لسانی ہونے کے باوجود آج لسانی تاریخ میں بھی اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

گو بعد ازاں اردو ادب کے ابتدائی تاریخ نویس تخلیقات کے سماجی سیاسی اسباب ورجحانات کا قبل از اور مابعد ادوار کے ساتھ منطقی ربط اور تبدیلیوں کے عدم جواز کی بنا پر ادبی ارتقا اور تخلیقی حرکت کی مکمل تصویر بناتے دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد ادبی تاریخوں میں تاریخیت کا یہ پہلو خاصا بہتر اور ادوار بندی زیادہ سے زیادہ منطقی وتدریجی انداز میں ڈھلتی دکھائی دیتی ہے۔ مگر ان سب کے ہاں تاریخ نگاری کی روایت شخصی، علاقائی، صنفی اور سیاسی بنیادوں پر استوار ہوئی اس لیے ادبی تواریخ میں ادوار بندی کے مسئلے کو اسی ذیل میں رکھا گیا۔ یوں اردو کی عمومی ادبی تاریخ نگاری دہلی، لکھنؤ، بیجا پور اور گولکنڈہ کے درباروں یا بڑی ادبی شخصیتوں اور اصناف کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' کی فہرست پر نظر دوڑائیں، وہاں کچھ اس قسم کی ذیلی عنوانات نظر آتے ہیں: قدیم شعرائے گولکنڈہ و بیجاپور، قدیم

شعرائے دہلی، میر وسودا کا زمانہ، انشاء اور مصحفی کا دور، غالب و ذوق کا زمانہ، شعرائے لکھنؤ، قدیم شعرائے دکن، زریں عہد اکبری، شاہان بہمنی، قطب شاہیوں کا عہد، عادل شاہیوں کا زمانہ، شعرائے دکن مغلوں کے زمانے میں، شعرائے اورنگ آباد، اساتذہ دہلی حصہ اول طبقہ متقدمین، اساتذہ دہلی حصہ دوم طبقہ متوسطین، اساتذہ دہلی طبقہ متاخرین، مرثیہ اور مرثیہ گو، دربار لکھنؤ اور اس کے شعراء، دربار رام پور وحیدر آباد، اردو ناول کی ابتدا، اردو ڈراما وغیرہ۔ اس کے اثرات ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخوں تک میں بھی ملتے ہیں۔ رینے ویلک نے لکھا ہے کہ ''اگر ادبی تاریخ کے ادوار کو سیاسی تاریخ کے ادوار۔۔۔ کے متوازی تقسیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ تسلیم کر لینا ہوگا کہ ادبی تصورات سیاسی تاریخ سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں اور اس کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔''(۱۴) سوال یہ ہے کہ کیا ذہنی تاریخ حکومتی و ریاستی ادوار کے زیر اثر آگے بڑھتی ہے؟ کیا ادوار بندی قومی تاریخ کے ادوار سے آزاد ہو سکتی ہے؟ کیا علاقائی بنیادوں پر کسی ادبی عہد کو تمام تر ادبی تاریخ میں رکھ کر شعور کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ کیا خود ادبی شخصیات کی بنیاد پر زمانی تقسیم ایک ہمہ جہت و ہمہ گیر تاریخی عمل کی حرکت کی نمائندہ ہو سکتی ہے؟

ہمارے ہاں سب سے زیادہ ناانصافی تاریخ کے ساتھ ہی ہوئی ہے۔ دس بارہ سال کی ابتدائی تعلیم میں اسے یا تو پوری طرح پڑھایا ہی نہیں جاتا یا اگر مختلف دیگر مضامین کا حصہ بنا کر پڑھایا جاتا ہے تو وہ بھی مقتدر قوتوں کے مفادات کے تحت پروپیگنڈا اور ذہن سازی کے لیے۔ نتیجتاً دس بارہ سال کی تعلیم کے بعد ایک عام طالب علم کے ذہن میں برصغیر کی تاریخ کا انتہائی مختصر خاکہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے محض وحشت، درندگی اور بہیانگی تھی جسے مسلمانوں کی آمد امن، خوشحالی، عدل اور مساوات میں بدل دیتی ہے۔ ۱۷۰۷ء تک کے مسلم دور کو اسی حوالے سے لیا جاتا ہے۔ لیکن پھر ۱۸۵۷ء تک روہیلوں، جاٹوں، مرہٹوں اور نادر شاہ کی پیدا کردہ بدامنی، قتل و غارت، انتشار اور سازشوں کا تصور ذہن میں گھر کر لیتا ہے۔ جس کے بعد مسلمانوں کے لیے انگریزی دور میں غلامی کی مشکلات، ظلم، ناانصافی، بے بسی اور ہندو مکاریوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر اچانک ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء کی صبح پھر سے امن، خوشحالی اور آزادی کا دور دورہ شروع ہوتا جاتا ہے۔ تاریخ کے حوالے سے عمومی تصور سازی کا یہ کمال دراصل ادوار بندی کی دین ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ نگاری میں بھی ایسے ہی مغالطوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جو کہ ہمارے ادبی تاریخ نویسوں نے قائم کی ہے۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں عمومی طور پر اردو ادب کا تاریخ نویس اپنی گٹھڑی اٹھائے پہلی بار امیر خسرو کے دور میں دہلی کے دربار کے چکر لگاتا دکھائی دیتا ہے اور کچھ ہی عرصے کے بعد محمد بن تغلق کے ہمراہ دکن کی طرف نکل جاتا ہے۔ پیچھے کیا ہوتا رہا اسے کچھ خبر نہیں رہتی۔ دکن میں وہ بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور گوجری درباروں اور کبھی کبھار خانقاہوں کا طواف کرتا ہے لیکن وہ نفسیاتی طور پر دہلی کے بڑے دربار ہی سے متاثر رہتا ہے اور ان نیم قومیت پسند حکومتوں کو نہ صرف باغی ہی سمجھتا ہے بلکہ یہاں کی زبان کو اردو کہنے کی بجائے دکنی ہی کہتا ہے اور فارسی اثرات کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اسی لیے جب اورنگ زیب عالمگیر دکن پر قبضہ کر کے اپنی فارسیت پسند دہلوی تسلط کی توسیع کرتا ہے تو ہمارا تاریخ دان بھی ولی کا دیوان بغل میں

دبائے واپس دہلی کی طرف چل پڑتا ہے اور پھر کبھی دکن کی خبر نہیں لیتا۔ دہلی میں فارسیت کے مقامی زبان پر شدید اثرات کے نتیجے میں جو لہجہ ادبی سطح پر سامنے آتا ہے اسے وہ اردو کا نام دیتا ہے اور میر وسودا کے عہد تک وہاں قیام کرتا ہے اور پھر اچانک نادر شاہ اور احمد شاہ کے پیدا کردہ نامساعد حالات کے تحت اسے لکھنؤ منتقل ہونا پڑتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں آ کر وہ پھر دہلی کو بھول گیا ہے۔ لیکن جب اسے دہلی میں غالب و مومن کی اطلاع ملتی ہے ہے تو وہ پھر واپس دہلی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران اس کا ایک چکر کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں بھی لگتا ہے اور چھوٹی موٹی اطلاع نظیر اکبر آبادی کی بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس تمام عرصے کے دوران ہندستان بھر میں کیا ہوتا رہا ہے اس نے اس کی کچھ خبر نہ رکھی کیونکہ وہ مخصوص نفسیات اور تصورات کا حامی نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب انگریز مغلوں کو بھگا کر دہلی پر قبضہ کر لیتے ہیں تو پھر ہمارا ادبی تاریخ دان بھی پینٹ کوٹ پہنے اور گھڑی کی جگہ بریف کیس اٹھائے سرسید کے ہمراہ علی گڑھ میں قیام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس دوران وہ ایک آدھ چکر لاہور کا لگاتا ہے۔ فارسیت پسندی کا تو وہ عادی ہے ہی لیکن اب وہ زیادہ تر انگریزی کو پسند کرتا ہے۔ ہمارے ادبی تاریخ نویس کی یہ چھوٹی سی بپتا ہمارے تاریخ نگاری کے رجحانات کے ساتھ ساتھ ادوار بندی کے مزاج کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

تاریخ نگاری کا یہ رجحان اردو ادب کے کئی سوالات اور ادوار نظر انداز کرتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں زیادہ تر ادبی تاریخ نویس وہ لوگ رہے ہیں جن کا بنیادی تعلق تاریخ کی بجائے ادب، تنقید اور تحقیق سے رہا ہے۔ ان کے ہاں تاریخ نویسی کا رویہ اساسی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے ان کا زیادہ تر کام اسماء و سنین کی تصحیح، کتب کی مرحلہ وار ترتیب اور فن و شخصیت پر محض تبصرے تک محدود نظر آتا ہے۔ اسی لیے اردو ادب کی تاریخ نگاری تاریخی شعور سے خالی محض تنقیدی مقالوں کا مجموعہ یا ''چند حقیقتوں کی بے ربط یکجائی'' نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے علی جواد زیدی ایسی ہی بے ربطیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں اودھی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کا پنجاب، گجرات، سندھ اور وسطی ہند میں ادبی قالب میں ڈھلنے عمل اور پھر فارسی، عربی اور سنسکرت سے استفادے سے نئی ادبی لسانی روایتوں کی تشکیل کا تمام دور ابھی تک آنکھوں سے اوجھل ہے۔ امیر خسرو سے پہلے اور بعد ازاں دہلی میں ولی کی آمد تک اور دہلی سے آگرہ میں دارالسلطنت کی منتقلی اور وہاں کی مقامی زبان کے نئی لسانی و ادبی روایت میں ڈھلنے کے عمل کا ایک طویل عہد ابھی تک گوشۂ گمنامی میں ہے۔ رحیم کے دوہے، بارہ ماسے، کتھائیں، ہندی قصیدے، کلام امیر خسرو، کبیر کے نغمے، سورداس، تلسی داس، نانک اور میرابائی کی شاعری اور ان میں ہندی، عربی، فارسی لسانی اشتراکات کا ارتقا بھی تاریخ کے پردے میں ہے۔ ابتدائی دکنی، برج بھاشا، اودھی، راجستانی، بھاکا اور پنجابی کی ادبی روایتوں اور ان کا فارسی روپ دھارنے سمیت سارا عظیم سرمایہ اردو ہندی اختلاف کی چپقلش کی نذر ہو رہا ہے۔ آخر مشترکہ تہذیب کے اس عظیم ورثے کو اپنا کر اردو کے آغاز اور ابتدائی تاریخ کو وسیع تر زمانی وسعت سے ہمکنار کیوں نہ کیا جائے؟ اس سب کے جواز میں علی جواد زیدی یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ:

> مجھے تو ڈر ہے کہ لوگ اس دور کی چھان بین شاید اس لیے نہیں کرتے کہ اس منزل پر اردو ہندی کی موجودہ شکلوں کی جگہ ایک ایسی زبان رائج تھی جو دونوں ہی کا نقش اول ہے۔ ہندی والوں نے جائسی کو لے لیا، رحیم کو لے لیا، کبیر کو لے لیا، ان کی تاریخ رفتہ رفتہ زیادہ بھرپور ہوتی جا رہی ہے۔ ہم اس قدیم سرمائے کے بارے میں جو ہماری لسانی

اورادبی روایات کے قریب تر ہے ابھی ڈراور جھک رہے ہیں۔ (۱۵)

مزید برآں وہ اس بات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ تذکرہ نویسوں کے تجاہل عارفانہ کے باوجود برج بھاشا اور ریختہ دونوں کی روایتیں جنہوں نے اردو کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا متوازی طور پر شاہ عالم کے قلعہ معلی اور کلام میں موجود ہیں لیکن انہیں بھی نظر انداز کیا گیا۔ پھر یہ بھی کہ تذکروں میں تو دہلی ولکھنؤ کے ادبی دبستانوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مگر اردو مورخین نے اپنی تاریخوں میں ان دبستانوں کو بطور ادوار خاص اہمیت دیتے ہوئے ادبی لسانی اختلافات کو ایسے غیر منطقی الگ الگ دبستانوں کی شکل میں ڈھال دیا کہ اشتراکات نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ جبکہ لکھنؤ کے ادبی ولسانی ارتقا، روایت اور اس کی خصوصیات کے علاوہ دہلی سے ادبی لسانی فرق کی سماجی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور لسانی وجوہات کا وہ کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اس دبستان سازی میں سارے ادب کے تصور کو غزلوں تک محدود کر دیا گیا کیونکہ لکھنؤ میں یہ صنف استادی دکھانے کی صفت بن گئی تھی۔

دراصل ادوار بندی میں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ ایسی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے کہ ادوار کی تشکیل اور ان کے امتیازات کے باوجود ادبی تاریخ ادب کا ارتقا اس طرح پیش کرے کہ اس میں ایک تسلسل قائم رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹی ایس ایلیٹ یورپی ادب کے متعلق لکھتا ہے کہ ''۔۔۔ یورپ کا سارا ادب ہومر سے لے کر اب تک اور اس کے اپنے ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے۔۔۔ کوئی شاعر، کوئی فنکار، خواہ وہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو، تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا، اس کی اہمیت اور اس کی بڑائی اسی میں مضمر ہے کہ پچھلے شعراء اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟''(۱۶) اسی لیے ایلیٹ کے نزدیک تاریخ ادب کے لیے زبان، تاریخ، تہذیب، فلسفے، معانی و بیان اور متعلقہ دیگر زبانوں کا ادب ناگزیر ہے۔ وہ مواد کے تاریخی پس منظر، فن وفن پاروں کی قدر شناسی، اصناف کے ارتقا کے شعور، افکار کی تاریخ اور تغیر پذیر ادب کو بدلتے ہوئے مگر مسلسل تہذیبی ارتقا کی روشنی میں پرکھ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ادوار بندی کے حوالے سے اردو ادب کے سب سے معروف مؤرخ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> تاریخ ادب نہ صرف ادب کی بلکہ سماجی تبدیلیوں کے زیر اثر زبان و بیان کی تبدیلیوں کی بھی تاریخ ہے۔ میں نے اردو کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل وتعمیر اور ردعمل وتبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے۔۔۔ تاریخ ادب میں جہاں کسی دور کے اپنے معیار اور نظام اقدار کی مدد سے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہاں ساتھ ساتھ دائمی ادبی معیاروں سے بھی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔۔۔ ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ، روایت کی تشکیل وتعمیر اور ردعمل وتبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا جائے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روح ادب بیک وقت سامنے آجائیں۔ (۱۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا ادوار بندی کے حوالے سے یہ تصور ان کے اس تاریخی شعور سے ابھرا ہے کہ ادب کی طرح تاریخ کو بھی زندگی کی روح کا مکمل آئینہ ہونا چاہیے کہ کلچر، فکر اور تاریخ کے امتزاج سے تاریخ ادب ایک وحدت بن جائے تاکہ زندگی

میں موجود حرکت و عمل کی واضح جھلک نظر آ جائے۔

ایک مؤرخ کا کام ادبی اقدار کی تشکیل اور ادبی ارتقا کے تسلسل کو قائم رکھنے والی زمانے کی بنیادی حقیقتوں کی دریافت ہوتا ہے۔ وہ قومی تہذیب کے ارتقا کو بذریعہ ادب اور ادب کو بذریعہ قومی تہذیب اظہار میں لاتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ ادب کا مقصد زندگی کے مکمل تر اظہار کے لیے ادب کو بطور سماجی مطالبہ اور بطور تہذیبی تاریخ پیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ محض معلومات نہیں دیتا بلکہ تاریخیت کو اس سوال کے جواب میں پیش کرتا ہے کہ کسی عہد کی ادبی تاریخ کی حرکیات سیاسی سماجی اور فکری مدوجزر سے کس طور متاثر ہوئی اور ادبی حوالے سے اس کے کیا نتائج نکلے؟

حوالہ جات

1۔Tanvir Anjum, "Temporal divides: A Critical Review of Majour Periodization Schemes in Indian History",Journal of Social Sciences,GCU, Faisalabad, vol.1, No. 1, July 2004, p 32.

۲۔ سلمان احمد، اردو کی ادبی تاریخیں: نظری مباحث، قصر الادب، حیدر آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۳۷

۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۷

۴۔ سلمان احمد، ایضاً، ص ۲۱۹، ۲۲۰

۵۔ سلمان احمد، ایضاً، ص ۲۱۹

۶۔ ظفر الاحسن لاری، ادبی تاریخ کے اصول، مشمولہ ''اردو ادب'' خدا بخش اورئینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، نمبر ۱، ۱۹۹۳ء، ص ۹، بحوالہ رسالہ ''ہندستانی'' الہ آباد، اپریل ۱۹۹۳ء

۷۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو (ایک تحقیقی جائزہ) حصہ اول، المضر اب پبلشرز، ملتان ص ۱۹

8۔Hudson, Wiliiam Henery, "An Introduction to the study of Literature", George G. Harrap & London, 1965, pg36

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص ۴۵

۱۰۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۹

۱۱۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، تاریخ ادب اردو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹، ۱۱، ۱۲

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۷
۱۳۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، مرتبہ: ڈاکٹر تبسم کاشمیری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۴
۱۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، ایضاً، ص ۲۸
۱۵۔ علی جواد زیدی، ''تاریخ ادب اردو کی تدوین''، مشمولہ ادبی تاریخ نویسی، مرتبہ عامر سہیل، سید، ڈاکٹر نسیم عباس احمر، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۷
۱۶۔ ٹی ایس ایلیٹ ''روایت اور انفرادی صلاحیت''، مشمولہ ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' مرتبہ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۵۰۴، ۵۰۵
۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، جلد دوم، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲، ۱۳